تشویش اُن کے چہرے پر تھی لیکن اُن کا لب ولہجہ اس تشویش کو ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

''شکریہ۔''

وہ لوٹنے لگے۔

''جی آپ بیٹھیں گے نہیں۔''

''میں ضرور بیٹھ جاتا لیکن باجی ذرا پریشان تھیں۔''

میں تھوڑی سی احساسِ جرم میں چلی گئی اور اصرار نہ کر سکی۔ کائی سائیکل پر گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے یوں احساس ہوا گویا خاں صاحب واپس جا رہے ہوں۔

میں اس سال کے دوران کبھی کبھی ملتان چلی جاتی۔ کبھی امی ہمارے ہاں دورے پر آ جاتیں۔ ریزی بھائی کو چھوڑ چکے تھے۔ وہ اور معظم کبھی مکتبہ جدید چلے جاتے۔ کبھی شقو سے ملنے مزنگ روڈ کا پھیرا لگاتے۔ کبھی انارکلی اور مال کی سیر کرتے۔ ریزی بھائی اپنی پینٹنگ سے غافل نہیں تھے۔ کوئی ایک آدھ سرورق بنانے کو مل جاتا تو بروقت اسے ڈالتے۔

آسمان سے وقت تھے۔ ابھی بیرونِ زمانے نے تیزی اختیار نہیں کی تھی لیکن خاں صاحب نے اپنے اندر تضاد کے باعث بڑی مشکلات ایجاد کر رکھی تھیں۔ نہ اُنہیں بھاگنے اور گریز کرنے پر اختیار تھا۔ نہ وہ بار بار خطوں کے ذریعے ہی ملاقاتوں کا سہارا لے کر مجھ سے ہر بار از سرِ نو رابطہ قائم کرنے سے اپنے آپ کو روک سکتے تھے۔

آپ کو جو صوفی ''رنگ رلیاں'' افسانے میں نظر آتا ہے اُس صوفی کی ابتداء یہاں ہی سے ہوئی تھی۔ مٹھ میں رہنے والے بھگت، کسی ڈیرے پر جپ تپ کرنے والا راہب ایسی ہی منہ بند کیفیت سے گزرتا ہے۔ صوفی بھی عشق کرتا ہے۔ اُس کی ضروریات بھی اُسے ستاتی ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اُس کے اندر بھی دنیاوی آسائش کے خواب انگڑائیاں لیتے ہیں۔

اگر صوفی ساتھ ساتھ شریعت کا بھی پابند ہو تو وہ اطلس وکمخواب کے فرشوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے کے خواب بھی دیکھتا ہے۔ میوے اُس پر جھکے چلے آتے ہیں۔ وہ ایسی حوروں کے خواب دیکھتا ہے جن کو نہ انسان نے ہاتھ لگایا ہو نہ کسی جن نے..... صوفی، راہب، بھگت اپنی جسمانی اور روحانی خواہشات سے بڑے سلیقے سے ان خواہشات کو پورا کرنے کے بجائے جہادِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی دنوں میں خاں صاحب نے بھی جہادِ نفس کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ مگر غالباً فرار کا تھا۔ جس مقام پر اپنی ڈھال حفاظت کے قابل نہ رہتی، وہ اس مقام پر بھونڈی جنگ کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی مصلحت سمجھتے۔

ایک صوفی کا واقعہ بہت بعد میں خاں صاحب اپنے چاہنے والوں کو بتایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی بادشاہ اپنے مرید کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں ایک ندی آ گئی۔ پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں ایک صاحب جمال جواں سال، طرحدار خاتون ندی کنارے کھڑی ہے۔ صوفی کو دیکھ کر بولی..... ''اے اللہ کے بندے! رات آیا چاہتی ہے مجھے پار پہنچنا ہے لیکن پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ کیا تو مجھے پار اترنے میں مدد دے سکتا ہے؟''

مرید اس وقت اپنے پائینچے اُٹھانے میں مشغول تھا۔ صوفی نے عورت سے یہ سوال نہ کیا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے ۔۔ ں وقت پار جانا ضروری ہے۔ چپ چاپ اُسے کندھوں پر اُٹھایا اور پار لے گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر عورت سے ۔۔ں بے اعتنائی سے اپنا راستہ لیا۔

کچھ دیر تو مرید نے اپنے اندر کھد بد کو برداشت کیا۔ پھر قدرے حیرانی اور خفگی سے بولا۔

"یوں عورت کو کندھے پر اُٹھا کر دریا پار کرانا باباجی..... کیا یہ گناہ نہیں؟"

باباجی ہنسے اور محبت سے بولے "واہ بھائی! میں نے عورت کو دریا پار کرتے ہی اُسے اپنے وجود سے اُتار دیا۔ تم ۔۔۔ سی میں مشغول ہو۔"

یہی جہادِ نفس کی پختگی ہے۔ اس مقام تک کوئی کوئی پہنچ پاتا ہے۔ خاں صاحب سلیقے سے زندگی گزارنے کا گر تو ۔۔تے لیکن کچے مرید کی طرح اس پرکار بند ہونے کی صلاحیت اُن میں نہ تھی۔ وہ تو ابھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے ۔۔کے پیچھے بھاگنے والے تھے۔ انہیں ریزی اور معظم نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ زوبی صاحب کے چکر تھے۔ اثر ۔۔ اور شفقت باجی کو اُن کی محبت پر تکیہ تھا۔ اتنی ساری کھینچا تانی میں وہ سکون قلب کا نسخہ کیسے لکھ سکتے تھے۔

معظم میرے ماموں زاد بھائی پتہ نہیں کیسے ہمارے گھر منتقل ہو گئے تھے؟ ماموں فضل نے انہیں بی اے کرنے ۔۔ے میرے پاس بھیجا تھا لیکن معظم دنیا جہاں کی کتابیں پڑھتے، کافی ہاؤس میں ادیبوں کی سنگت میں بحث مباحثہ ۔۔ لیکن کورس کی کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ریزی اور مجھ سے زیادہ معظم خاں صاحب کی زندگی میں دخیل ہو گئے۔

دیال سنگھ کالج میں نوکری کر کے جب خاں صاحب گھر لوٹتے تو معظم کو 1-مزنگ روڈ پر منتظر پاتے اور پھر ۔۔ تیسری منزل پر شقو جی اور معظم باتوں کے غبارے اُڑایا کرتے۔ جس قدر معظم اردو ادب کا رسیا تھا اُسی قدر ریزی ۔۔یت سے دُور تھا۔ وہ کینوس رنگ اور پراسپکٹیو (Prospective) کے چکروں سے کبھی آزاد نہ ہوا۔

ابھی ہم کالج میں تھے۔ جب خاں صاحب کی دوستی غلام محی الدین اثر صاحب کے ساتھ طے ہو گئی تھی لیکن ایم ۔۔ے دوران ہی ایک اور چکر چلا۔ سال کے بعد نئی کلاس نے داخلہ لیا۔ ان میں باجی شفقت تھیں۔ اُن کا لب و لہجہ شستہ ۔۔ نسانی قابلیت قابل مخدوش تھی۔

پروفیسروں کی عادت ہے وہ ہر نئی کلاس میں اپنے منظورِ نظر چن لیا کرتے ہیں۔ ہماری کلاس میں سے اثر ۔۔ نے میرا انتخاب کیا اور نئی نفقتھ ایئر کی کلاس میں اُنہیں شفقت ایسی نظر آئیں جو قابل توجہ تھیں۔

جب چھوٹی اڑانوں سے خاں صاحب کی سیری نہ ہوئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لاہور سے کہیں اتنی دور نکل ۔۔ جہاں تک اُن کے اندرونی تضاد کی رسائی نہ ہو۔ ان دنوں خاں صاحب روم جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ایم ۔۔ کالج میں ان دنوں سید عابد علی عابد پرنسپل تھے۔ جب روم یونیورسٹی سے ملحقہ ادارے (ISMEO) میں خاں صاحب ۔۔ اردو پڑھانے کا جاب مل گیا تو وہ چھٹی کے سلسلے میں سید عابد علی عابد کے پاس پہنچے۔ پتیر سانتریالی کا Appo... لیٹر ہاتھ میں لیا اور اسے سید صاحب کی میز پر رکھ کر بولے "روم سے یہ خط ملا لیکن اب چھٹی کا مسئلہ۔" ہمیشہ کی طرح وہ تضاد کا شکار تھے۔ روم میں نوکری بھی کرنا چاہتے تھے اور دیال سنگھ کالج کو چھوڑنا اُنہیں قابل

قبول نہ تھا۔

سید عابد علی عابد نے خط دیکھا۔

''بھائی یہ تو اطالوی میں ہے۔''

''اس کے معنی یہی ہیں کہ اگر میں بروقت پہنچ گیا تو نوکری مل جائے گی۔''

''سوچ لو یہ کوئی سرکاری خط معلوم نہیں ہوتا۔''

''بس آپ مہربانی فرمادیں، باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔''

عابد صاحب نے اجازت مرحمت فرمائی اور خاں صاحب نے روم کا رختِ سفر باندھ لیا لیکن 1956ء کا یہ دن اُن کے لیے بڑے طوفانی سال تھے۔ اب اُن کی ڈائریاں اور نوٹس دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس کرب سے گزر رہے تھے۔ ذرا دیکھیے۔

اُس نے آگے بڑھ کر پیتل کے پتروں سے منڈھے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟''

اور اندر سے آنے والی آواز اس کے سینے میں ٹھڈے کی طرح لگی۔ وہ چبوترے سے گلی میں کودا اور شمال کی جانب بھاگ گیا۔ گلی کا ایک کتا عادتاً اس کے پیچھے بھاگا اور پھر کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چاند ایک کالی بدلی سے نکل کر دوسری میں چھپ گیا۔ سرس کے پتوں سے بارش کی کچھ بوندیں جھڑ کر اس کی مانگ میں ٹھنڈی سلائی کی طرح پھر گئیں۔ اس نے اپنی رفتار مدھم کر لی لیکن پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

کسی نے ضرور دروازہ کھول کر ایک بار پھر پوچھا تھا..... ''کون ہے؟'' اس کی چھاتی نے دھوں کر کے خشک کھانسی کی آواز نکالی اور وہ پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

ٹین کی چھت پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپاٹپ برس رہی تھیں اور پلیٹ فارم کی روشنی میں ریل کی سیاہ پٹری ڈھل رہی تھی۔ لوہے کے بنچ پر ساگوان کا موٹا تختہ لگا تھا اور فضا میں نمی کی وجہ سے اس پر جما ہوا میل لسلسا ہو گیا تھا۔ نیا سال طلوع ہونے میں پورے دو دن باقی تھے اور ساگوان کے تختے میں لگے ہوئے آہنی کا بلے بڑے ٹھنڈے تھے۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر اُٹھا کر دونوں کان ڈھانپ لیے۔ کالروں کے نیچے کپڑے کا اصل رنگ نکل آیا۔ ایک بارہ ماشیا ہتھوڑی کے دستے میں ربڑ کی واشریں فٹ کرتا اندر آیا۔ اس نے کوٹ کا اصل رنگ دیکھے بغیر کہا۔ ''رات یہاں کاٹو گے؟''

''ہاں۔''

''کہاں جانا ہے؟''

''لاہور۔''

''لیکن یہاں تو بہت سردی ہے۔ تمہارے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں؟''

''نہیں۔''

"اچھا"

"اچھا" اس کے سر پر دست شفقت بن کر پھر گیا۔ بارہ ماشیا مسافر خانے سے باہر نکل گیا اور پلیٹ فارم کی ... کی پٹڑی پھر ڈھلنے لگی۔

سورج کی پیلی روشنی میں پیتل کے پترے چمک رہے تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔

اور چوکھٹ کے ایک طرف "میلا رام داروغہ صفائی" کا بورڈ لٹک رہا تھا۔

اب ڈی کوثر افضل کے دفتر میں موجود ہے اور اس سے قطعہ زمین کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا ہے۔ افضل کچھ ... سا اس کی باتوں پر توجہ دے رہا ہے۔ اتنے میں پرویز دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی ایک نظر ڈی کوثر پر پڑتی ... وہ بھائی سے کہتا ہے کہ وہ میں سکوٹر کی چابی تو نیچے ہی بھول آیا۔ وہ چابی لینے جاتا ہے اور افضل کوثر سے پھر معذرت ... بادل نخواستہ اس کے دفتر سے نکلتا ہے۔ سیڑھیوں پر اس کی مٹھ بھیڑ پرویز سے ہوتی ہے جو چابی لے کر واپس ... پرویز کوثر کو روک کر پوچھتا ہے "آپ کا نام الہ داد تو نہیں؟" کوثر کہتا ہے "اللہ دتہ۔"

پرویز کہتا ہے "او شاید!"

اللہ دتہ کہتا ہے "لیکن اب میں اے ڈی کوثر کہلاتا ہوں۔"

پرویز کہتا ہے "ہم آپ کو آٹھویں میں پڑھتے رہے ہیں۔" مکار کوثر کہتا ہے۔ "اوہ ٹھیک، خوب یاد آیا۔"

پرویز زمین کی کہتا ہے وہ آسمان کی بتاتا ہے لیکن دونوں ایک دوسرے سے تفصیلی حال پوچھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ... ڈی کوثر پراپرٹی ڈیلر ہے۔ پرویز اپنے بارے میں بھی بتاتا ہے اور پڑھ کرنے اور تجارت میں بین الاقوامی شہرت ... ذکر کرتا ہے۔

پرویز اسے اپنا پتہ دیتا ہے اور کوثر اس خوبی سے ملتا ہے کہ مزاج کے ساتھ ساتھ پرویز کے دل پر یہ بات بھی رقم ... ہے کہ یہ اُس کا پرانا کلاس فیلو ہے۔

پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چل دیتا ہے۔

Describe دے کر بتاتے ہیں کہ کوثر ایک کٹڑی میں ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچ کر نجیا کو بتاتا ہے کہ ... بھائی کو گیا تھا لیکن چھوٹا بھائی شیشے میں خود اُترتا چلا آیا۔

تمناؤں کے تیز گام شبدیز کو دوڑاتے ہوئے میں ایک صحرا میں گر کر بے ہوش ہو گیا تو ایک لُولے نے مجھے ہوش ...

"تو نے پیدل چلنے میں کیوں احتراز کیا؟" میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

"اب تجھ سے پیدل بھی نہ چلا جائے گا۔"

ایک مرتبہ میری محبوبہ جہنم میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے کہا۔ "جانِ تمنا! اس سیاہ خانے میں تم کیوں چلی

اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ ''مجھے کسی نے بتایا تھا کہ دوزخ کے شعلوں نے تمہاری بینائی چھین لی ہے تمہاری بیمار پُرسی کو آئی ہوں۔''

آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے برآمدے کے بیچ میں نے اُسے بازوؤں میں لے لیا اور کہا ''اب تمہاری ہے'' لیکن غلام گردش ٹس سے مس نہ ہوا اور میری باری یونہی چلتی رہی۔

راولپنڈی

(1951ء)

مہینے کا آخری دن ہے۔ ابھی ابھی راولپنڈی پہنچا ہوں اور اُسی ہوٹل میں قیام کر رہا ہوں جہاں دو مہینے گزا تھے۔ جہاں رات رات جاگ کر سکرپٹ لکھے تھے۔ اخباریں نشان کی تھیں اور دفتر کی فائلوں میں سرکاری قسم کے ا کیے تھے۔ شہر وہی ہے، بازار وہی ہے، عمارت وہی لیکن کمرہ اور موسم بدل گیا ہے۔ پنڈی مجھے کبھی بھی اجنبی دیس مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں اس شہر میں پیدا ہوا۔ اسی شہر کے کسی سکول میں پڑھتا رہا۔ یہیں سے میں نے بی اور پھر چند سال بی۔ ایم۔ اے میں ملازمت کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔ اسی شہر کے راستوں پر تھوڑی دیر کو میرا جنا اور پھر مجھے بڑے قبرستان کے ایک گوشے میں دفن کر دیا گیا۔ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے سارے ایام میں دیس میں گزارے اور اسی شہر میں بسر کیے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ میں اپنے ہوٹل سے ریڈیو سٹیشن کو جانے والی سڑک کے علاوہ اور کسی راستے واقف نہیں ہوں۔ میرا سارا سامان یہیں تھا۔ پنجاب کے سیلاب کی وجہ سے میں اپنا سب کچھ اُٹھا کر لاہور نہ لے جا ٹرنک اور بستر مفتی کے پاس چھوڑ کر ایک اٹیچی کیس لے کر لاہور چلا گیا۔ آج مفتی نے میرا ٹرنک لا کر دیا۔ میں نے کھ مجھے ایسے لگا جیسے یہ میرا ٹرنک نہیں۔ اس میں کچھ کپڑے تھے، استعمال شدہ اور میلے۔ ایک کیمرہ تھا۔ کافی کا ایک سا تھا۔ دو پنسلیں۔ نثر شدہ ''ڈھول کے پول'' کی چند کاپیاں اور کچھ خطوط۔ میں دیر تک ان خطوں کو پڑھتا رہا اور ابھی نے خطوط خوانی ختم کر کے قلم اٹھایا ہے۔''

(چند خطوط خاں صاحب کے نام)

(سب سے بڑے آفتاب بھائی خاں صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں جو انہوں نے تراڑکھیل سے لکھا۔)

عزیزم اشفاق سلمہ!

آپ کا پہلا خط بنام اماں جان اور دوسرا میرے نام تشریف لایا۔ دلی مسرت ہوئی۔ حیرت ہے کہ جو خط نے آتے ہی آپ کو پشاور روڈ کے پتہ پر لکھا تھا، آپ کو کیوں نہیں ملا! اگر یہ آپ تک پہنچتا تو آپ اس کا تذکرہ کرتے۔

ہم بفضلِ تعالیٰ سیلاب کی زد میں نہیں آئے۔ کرشن نگر اور راجگڑھ روڈ وغیرہ میں پانی اب تک ہے لیکن اُسے ... چاہیے۔ خطرناک نقصان ان دیہات کو پہنچا جو تحصیل شاہدرہ میں دریا کے کنارے آباد تھے۔ افتخار میاں اور ... نہیں آئے۔ مری میں آپ کے ساتھ جو راحت میں نے کنگز ہوٹل میں پائی، وہ آپ کے موجودہ ہوٹل میں ... جنت کا جھونپڑا جہنم کے محل سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ یہ آپ کو گمان محض ہے کہ مری میں مجھے تکلیف ہوئی۔ ... مجھے آرام نہ ملتا تو میں اتنا تنومند کیونکر ہو جاتا۔ میں تو ہمیشہ یہی کہوں گا کہ مری کی پُر بہار سیر صرف آپ کی ... تھی۔

(ایک خط جو انہیں بابا محمد خاں نے مری لکھا)

عزیز محترم سلامت رہو! السلام علیکم، مزاج شریف۔

آپ کا خط آیا، حالات سے آگاہی ہوئی۔ یاد آوری کا شکریہ۔ تاحال مشینری کے متعلق کوئی انفرمیشن نہیں ... محمد خاں صاحب نے جب اُن کو سعید احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کا منشا مشینری لگانے کا ہے تو چچا صاحب ... سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سعید احمد خاں کولڈ سٹوریج لگا رہے ہیں۔ اُن کو کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ہم کو کچھ ... روپے سکیں گے۔ یہ بات اُنہوں نے بطور پیش بندی کے کی تھی۔ مبادا محمد خاں اُن سے کچھ روپیہ مانگ لے۔

فیسرین سنو اور کریم کے لیے شیشی کی ضرورت ہے۔ سینٹ کی ضرورت ہے۔

اشتیاق میاں بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ افتخار بھائی مع بال بچوں کے لاہور آنے والے ہیں۔ آپ نے ... گرمی کی بابت دریافت فرمایا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ ہم کباب سوختہ ہیں ہمیں سردی گرمی سے کیا کام؟

فقط محمد خاں

(کاکی کا خط)

محترم اشفاق صاحب، السلام علیکم!

آج عید ہے۔ روایتی نہیں بلکہ اصلی۔ میرے ہاتھوں میں آج سی۔ ایم۔ جی (سول اینڈ ملٹری گزٹ) ہے اور ... غور سے اردو ایم۔ اے کا رزلٹ پڑھ رہی ہوں۔ کاش آپ کی طرح مجھے بھی Subtle Thanks ادا کرنے ... ڈھنگ آتے تو میں بھی کوئی دس پندرہ برس پرانا واقعہ یاد کر کے اس کی روشنی میں آپ کو مبارکباد دیتی لیکن بہت ... چنے کے باوجود بھی نہایت معمولی واقعات یاد آ رہے ہیں اس لیے معذور رہوں۔

مجھے یہ بتایئے کہ آپ نے شکریہ ادا کرنے کے ڈھنگ کس سے سیکھے؟

شیخ سعدی سے؟

یہ آپ کی محنتوں کا ثمر ہے کہ کسی کی دعاؤں کا اعجاز؟ یا پھر کہیں درپردہ آپ نے بھی تو اپنی نئی سائیکل سے امداد ... بہرکیف نتیجہ واقعی قابلِ رشک ہے۔ دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

من وسلویٰ کھلانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے کہ پھر...... چلیے صاحب! میں تو اس کا تقاضا کرنے کی نہیں۔

... ہم جماعتوں سے آپ خود نپٹ لیجیے۔ میں تو تھوڑی سی مٹھائی پر اکتفا کر لوں گی۔ وہ بھی اگر آپ کھلانا چاہیں تو۔

ماچھا، امی، پرویز اور معظم کی طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔

(عمر کا خط)

اشفاق جی!

مہاجرین پروگرام میں گردوپیش (آج کل) لکھنے کے لیے آپ نے دو دن کا وعدہ کیا تھا لیکن مری آ کر نیت خراب ہوگئی ہے اور میں ایک دن اور یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری خاطر اسے ایک دن یعنی 4 تاریخ (وار) اور سکرپٹ لکھ دیں گے۔ بے حد مشکور ہوں گا۔ باقی مری آ کر محسوس ہو رہا ہے کہ پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔

(پاس ہونے پر شفقت کا خط مری پہنچا)

شفقی بھیا نمستے! خوشیوں اور مسرتوں میں ڈوبی ہوئی، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اور شائستگی اور اطمینان سے ہوئی ننھی سی مبارک کباد قبول ہو۔

گو میں اس قابل تو نہیں کہ آپ کو یہ چند حروف لکھ سکوں کیونکہ میں بھی اسی لاہور کی باسی ہوں جس سے آپ کو شدید نفرت ہے اور یوں بھی یہ مبارک باسی ہو چکی ہے۔ لیکن بقول غالب کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ قبول نہیں ہوتی اور سب خیریت ہے۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور خوش!

اس خط کے نیچے باجی کے انگریزی میں دستخط ہیں "S.Ara"

(منشی نعمت اللہ خاں کا خط)

گرانقدر۔ عالی مرتبہ اشفاق احمد خاں صاحب۔ ہمیشہ ہمیشہ سلامت باشد!

السلام علیکم ہا مصافحہ کے بعد واضح رائے عالی ہو کہ اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت مدام نیک مطلوب ہے۔ آپ نے راولپنڈی آ کر اپنی خیریت سے آگاہ نہیں فرمایا۔ اس لیے مقامِ شکوہ ہے۔ اُمید ہے آپ اللہ کریم کے فضل سے خوب ہشاش بشاش ہوں گے۔ آپ جس محبت اور خلوص سے خادم کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں، بندہ اس کا احسان پشتوں تک نہ بھلا سکے گا۔ عرض یہ ہے کہ میرا لڑکا عرصہ پانچ سال سے گھر میں بے کار بیٹھا ہے۔ Type کا کام جانتا ہے۔ اگر آپ کے خیال شریف میں اس کے واسطے کوئی آدمی دکھائی دیوے تو تحریر فرمائیں۔ اس کی بے کاری نہایت ہی بُری ہے۔ قبیل داری میں تو ایک دن بھی بغیر آمدن کے گزارنا مشکل ہے۔ خیر آپ کے خیال مبارک میں کوئی تجویز ہو تو فرمائیں۔ خداوند کریم آپ کو خوش و خرم سلامت رکھے۔ آمین ثم آمین۔

باقی مجھے اپنی صحت کے بارے میں ضرور اطلاع دیں کہ اب کیا حال ہے۔ خدا آپ جیسے لائق فرزند گھر پر فرمائے۔ خدا کرے آپ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کریں۔ خوب عیش و عشرت و افر و جلال با اقبال زندگی بسر ہو۔ ثم آمین۔

فقط والسلام

تابعدار منشی نعمت اللہ خاں

(اس خط میں خلوص کا لفظ قابلِ غور ہے)

یک خط انصار کا ہے۔اس کے آخر میں لکھا ہے۔

شقو بھیا! یہ خط کسی کو دکھائیے نہیں۔

یک کونے میں لکھا ہے۔

شقو بھیا! جواب میں ذرا ان باتوں کا ذکر نہ ہو کہیں۔

افتخار بھائی کے خط کے چند جملے (اپنے بیٹے رومیو کا ذکر)

شقو میاں سلامت رہو! عزیزی تمہاری بھتیجی بہت شرارتی ہوگئی ہے۔ ان دنوں رضیہ کے سکھلانے پر مجھے جتا ہے۔ بالکل اپنے چچا ابا یعنی تمہاری تصویر ہے۔ ضد کا یہ عالم ہے کہ مجھے اس کی بات بات پر تم یاد آجاتے ہو۔ رح زمین پر لیٹ کر اور مٹی میں لوٹ کر اپنی ہر بات منواتا ہے لیکن پھر بھی جب میں اسے غور سے دیکھتا ہوں تو ہوتا ہے کہ ابھی تمہارے جیسی ضد کا بچہ ہمارے خاندان میں پیدا نہیں ہوا۔

اس کی اور تمہاری ضد میں یہی فرق ہے کہ یہ رنگ برنگے غبارے لے کر مان جاتا ہے اور تم دونوں جہان کی لے کر بھی نہ مانا کرتے تھے۔ اب تو لاہور آجائے گا۔ تمہیں بھی آنا چاہیے کیونکہ جو جو ظلم بچپن میں تمہارے جیسے چپن پر ہوتے رہے ہیں کہیں اس پر بھی نہ ہوں۔

منیر معذرت کرتی ہے کہ بچوں کی علالت کی وجہ سے تمہارے خطوں کا جواب نہ دے سکی۔ شقو میاں! اب چھوڑ دو نوکری۔ ریڈیو کی نوکری مری کی وجہ سے تھی نہ کہ نوکری کے سبب سے۔ عزیزی خدا مالک ہے فکر نہ کیا کرو۔ پتہ نہیں رنے کی طبیعت کب صحت یاب ہوگی۔

اثر کا خط (روسی سگریٹ۔ ریڈلیبل کی چائے کا تحفہ ملنے پر)

عزیز من اشفاق!

کل شب کو تمہارا گراں بہا تحفہ ملا۔

اور آج طوفان اور آندھیوں میں لکھی ہوئی چٹھی۔ پرسوں زولی نے کہیں سے ہاتھ مارا تھا اور حسب دستور یقیدہ کے مع بچوں کا نذرانہ عقیدت نکالا تھا۔ سٹوڈیو سے جھومتے جھامتے گھر پہنچے تو جاوید نے پارسل دیا۔ اول شب یقت ریڈلیبل کا منہ میں تازہ تازہ لطیف ذائقہ اور انتہائے افلاس کے عالم میں روسی سگریٹ کا ڈبہ۔ ماشاءاللہ، خدا وی کے نہیں اس کی عظمت کے بھی قائل ہوگئے اور اللہ جانے تمہیں کیسی کیسی دعاہائے دارین دیں۔ تمہاری خوش یہ عقیدہ تھی اب جزو ایمان بن گئی ہے۔

آج تمہارا خط ملا۔ برق و باراں میں لکھا ہوا لیکن میری جان تمہیں یہ کیوں مشتبہ لگتا ہے کہ وہ مجھے ملے گا نہیں۔ چھت کو تھامنے کے لیے دو دیواریں بہت ہوتی ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ زندگیاں اس سے بھی مہین سہارے پر مدتوں رہتی ہیں۔ چھت تو پھر بھی چھت ہوئی اور بالخصوص جب اس کے نیچے ایک ندی دبکی ہوئی ہو۔ موت کو زندگی سے کوئی ی۔ زندگی موت کی محبوبہ ہے۔ جس سے موت اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ موت زندگی کی گھات میں نہیں رہتی، زندگی موت نے کے لیے دام بچھاتی ہے اور اپنی رنگینیاں دکھا دکھا کر اسے پھانستی ہے۔ پھر بھلا تمہاری چٹھی نہ ملتی تو کیونکر۔

کاکی کو حسبِ ہدایت تمہارا اسلام پہنچا دیا۔ وہ تم سے سخت ناراض ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تم بڑے ناخلف بیٹے ہوئے اور یہ کہ اب وہ تمہاری ممی نہیں رہی۔

آخر تم آ کب رہے ہو؟

تمہارا

اثر

اور میں نے ان سارے خطوں کو جمع کر کے اور ان پر ایک آخری نظر ڈال کر cent Brand Safety Matches کی ایک تیلی سے جلا دیا۔

نہ جانے مجھے کیوں ہمیشہ کولمبس کی طرح ان دیکھے براعظموں کی طرف سفر کرنے کا شوق ہے۔ جوانی میں بڑی آرزو تھی کہ میں ماسکو سے ولاڈی واسٹک تک پورا ایک ہفتہ ٹرین میں گزاروں۔ اُس کے کھیت، شہر، قصبہ، نہریں سینما سکرین کی طرح کھڑکی سے گزر جائیں اور مجھے بغیر کسی واقعے سے دوچار ہوئے ان کا منظر نامہ مفاہمت آ جائے۔

میرا یہ خواب تو پورا نہ ہو سکا لیکن 1975ء میں جب چند ادیبوں کو روس مدعو کیا گیا تو اس گروپ میں میرا تھا۔ میرے علاوہ شیخ ایاز صاحب سندھ سے، خاطر غزنوی پشاور سے تھے۔ اس سفر میں مجھے ماسکو سے لینن گراڈ اتفاق ہوا اور ہولی رشیا کی یہ زیارت کسی عجوبہ سے کم نہ تھی۔

ایم اے اردو کے تجربے سے میں نے جو کچھ مالِ غنیمت اور پونجی جمع کی اُس کا زیادہ تر تعلق اپنی سمجھ بوجھ مطابق حالات کو سمجھنے کا تھا۔ اب میرے پاس کچھ ایسی یادیں ہیں جن کا تعلق موسموں، ذومعنی باتوں، ابہام بھرے سے زیادہ نہیں۔ یہ ساری جھوٹی سچی ادھوری باتیں اس لیے بامعنی سمجھتی ہوں کہ شاید اشفاق صاحب کو سمجھنے میں کچھ سکے۔

گو کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدے، تخیل، احساس کے ہمراہ بھی قریب قریب ناممکن ہے۔ کے سارے وجود پر اگر سرچ لائٹ بھی پڑتی ہو تو ایسے اندھیرے کونے کھدرے میں ضرور رہ جاتے ہیں جن میں اس شخص کی خوبیاں، خرابیاں دبکی رہتی ہیں۔

انسان کا پتھر و دھات کے زمانے سے اب تک یوں ارتقائی سفر میں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گیت چھپے ہوئے رازوں کی بدولت ہے۔ انسان کا علم اسی لیے ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے تمام اعمال کو جانچنے کے لیے نیت سے بڑا کوئی Catalyst نہیں۔ کبھی کبھی نیکی بھی بدنیتی پر محمول ہوتی ہے اور بار بار رابن ہڈ (Robin Hood) جیسے ڈاکو کے سر پر کامیابی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

میں نے ایک لمبا وقفہ خاں صاحب کے ساتھ گزارا۔ اُن کو قریب سے دیکھا۔ فاصلے سے مشاہدہ کیا۔ یوں بھی ہوا کہ مجھے ان کے رویئے، عمل اور سوچ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات گورنمنٹ کالج کے اولین دنوں میں

بڑی تھی۔ شفو جی جو کچھ کرتے اُن کے نتائج جو کچھ نکلتے، اُن کی نیت صاف آئینے کی طرح آبدار رہتی۔ اسی نیت وہ کسی شخص سے تادیر ناراض رہنے والے شخص نہ تھے۔

رشتے ٹوٹ جانے پر، حیثیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی اُن کی نیت میں ڈول نہ ہوتی۔ اسی لیے اُن سے منافقت کبھی سرزد نہ ہوئی۔ غلطی سرزد ہو جاتی تو بڑی شرمساری سے اعتراف کر لیتے۔ جوابی کر بیٹھتے تو سر جھکا کر جھینپی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی لیے اُن کی تحریروں میں مبالغہ آمیزی سے کبھی انہوں نے زندگی آراستہ نہ کی۔

نیت کی صفائی کے باوجود جس تضاد کا وہ شکار رہے وہ بدستور قائم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سفر، نوکریاں جب تشفی بخش نہ ہوئیں تو انہوں نے روم جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے غالباً سکھ کا سانس لیا لیکن آزادی کی قیمت ادا کر کے ملتی ہے۔ کوئی قوم یا کوئی فرد کبھی بھی یہ قیمت ادا کیے بغیر آزاد نہیں ہو سکا۔

انہیں غالباً اس سفر میں مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے تھے لیکن روم سے ان کے خط آتے رہے اور پاکستان میں جو رابطہ تھا اب قدرے غیر محتاط ہو گیا۔ ایک Defense mechanism ہمیشہ کی طرح ساتھ تھا۔ وہ بیماری اور بار بار ذکر کرتے۔ مجھے علم تھا کہ وہ دل آزاری کو گناہ سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا مسلک غالباً محبت تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا سب سے بڑا روپ ہے۔

اشفاق صاحب نے جب اردو بورڈ میں سروس کی تو یہاں کئی ماتحتوں کو ڈانٹا، برا بھلا کہا، لیکن یقین جانیے یہ اسی کے تحت اپنی روزی حلال کرنے کے تحت کیا ہو گا۔ انہوں نے کبھی کسی کی اے سی آر خراب نہ کی۔ ان کے جانے کے بعد پتا چلا کہ بورڈ کے کچھ کارندوں کی وہ باقاعدگی سے مالی مدد بھی کرتے تھے لیکن اس کا ذکر بھی کبھی انہوں نے نہیں

گھر پر ان کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ پھر ان کی زندگی میں اُنہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ ڈانٹ پڑ جاتی لیکن سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ حجام، قصائی، دودھ والا، سبزی فروش ابھی تک چلے آتے ہیں اور روتے ہیں جیسے ان کا کوئی اپنا اُنہیں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

ان کے برعکس مجھے دوسروں کی دنیا سدھارنے کا اتنا شوق ہے۔ دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا چسکا ہے کہ اپنے پوچھے بغیر میں مجبور لوگوں کو مشورے دیئے چلی جاتی ہوں۔ میری نیت ہوتی ہے کہ لوگ مجھے سراہیں، میری تحریریں اور میری دانش کے قائل ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے جو وقت کے ساتھ اب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے پڑھنے لکھنے میں میری مدد کی۔ میری تربیت میں اتنی تگ و دو کی وہاں مجھ سے ایک راز چھپا گئے کہ ہر موسم میں نیت کے قطب نما کو کیسے سیدھا رکھا جاتا ہے۔

اتنی بات مجھ پر عیاں ہو گئی ہے کہ نیت کی صفائی سے ہی ان میں محبت کا چشمہ اندر ہی اندر بہنے لگا تھا۔ وہ اس کا اعلان کرتے نہ اس کا پرچار ہی کرتے۔ ان کا رابطہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بڑی خاموشی سے پروان چڑھتا رہا۔ ان کے چلے جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ان کے قارئین، ناظرین، مداحین کی چاہت بھی کسی طور ان

سے وقت کے ساتھ کم نہیں ہوئی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی، کمی بیشی، اونچ نیچ محبت کے سامنے یہ بیکار باتیں ہیں۔ محبت کرنے والا محبوب کی خوبیاں خرابیاں دیکھ نہیں پاتا بلکہ محبوب کی خرابیوں کو اپنی کج ادائیوں کی طرف کر لیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور غالباً اسی محبت کی تلاش خلق کو بابوں کے قریب لے جاتی رہی۔

مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت کے اہل نہیں ہوتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر اس قدر مان ہوتا ہے کہ وہ میں کیڑے نکال کر، کسی اور کا قد چھوٹا کر کے، کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی عظمت کی کلا جگاتے میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ ان میں انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی کے دریا ساتھ ساتھ بہتے گے۔ ان میں بھی حب و جاہ کی طلب ہو گی لیکن ان کے چاہنے والوں کی توجہ کبھی ادھر نہیں گئی۔ وہ کبھی ان کی بشری دھیان نہ دے پائے اور انہیں ایک بہت بڑا آدمی، برگزیدہ صوفی اور انمول ادیب سمجھتے رہے۔

لیکن سوسائٹی میں کچھ نکتہ چیں قسم کے لوگ رہتے ہیں جو محبتی طریقہ نہیں اپنا سکتے اور پکڑ پکڑ کر، بینت بینت خاں صاحب کی غلطیاں نکالنے کے درپے رہتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں میں صرف رویے کا فرق ہے۔ مہربان کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے اور عیب ڈھونڈنے والے اپنے سچ پر اپنی ذہانت پر اعتماد کرتے ہیں لیکن یہ بہت باتیں ہیں۔ 24-ایس کینال پارک میں نہ مجھ میں یہ جاننے کی صلاحیت تھی۔ نہ اشفاق صاحب کسی ایسے مقام پر پہنچے کہ ان کے متعلق اندازے لگا سکیں۔ ابھی زندگی کو سمجھنے کے لیے نہ فلسفے کی ضرورت تھی نہ روحانیت کی، سب کچھ دن کے چکر میں محبوس چل رہا تھا۔

اتنی بات ضرور تھی کہ خاں صاحب جس فرار کی راہ پر جاتے جس شہر میں پناہ لیتے وہاں سے خطوں کا سلسلہ رہتا۔ افسوس جو خط میں نے انہیں تحریر کیے، وہ اس لیے میں نے نذرِ آتش کیے کہ میں خوف کا پرندہ ہوں۔ مجھے تالی جا سکتا ہے۔

14-ایس، کینال پارک

اولاد اپنے ماں باپ کی محبت پر اس درجہ تکیہ کرتی ہے کہ اُسے کبھی علم نہیں ہو سکتا کہ وہ ماں باپ کی آزادی میں کس قدر رخنہ اور اُن کے لیے کیسی سردردی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ پرویز بھائی اور میرا بھی یہی حال تھا۔ ہم کینال پارک میں بڑی آنند کی کمفرٹیبل زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمارے پاس زینب جیسی جانثار اور لالو جیسا سعادت مند ملازم تھا لیکن امی اندر ہی اندر ہمارے لیے پریشان رہا کرتی تھیں۔ میری شادی نہ ہو چکی تھی۔ ریزی بھائی کا روزگار ڈھب کا نہ تھا۔ وہ مجھے ساتھ ملتان لے جاتیں تو وہاں اور مشکل پیش آتی۔ اُن دنوں افسران بالا ابھی فرعون صفت نہ ہوئے تھے۔ امی کا سرکاری میٹنگوں میں ہائی اتھارٹی افسران سے رہتا۔ وہ بھی امی سے بطریق احسن مہربانی سے پیش آتے۔

ڈاکٹر احمد خاں جو ملتان کی سرکاری زمینوں کے کرتا دھرتا تھے اور ڈاکٹر طوسی جو سرکاری ہسپتال کے انچارج تھے، اپنی چھوٹی بہن ممتاز طوسی میری والدہ کی ماتحت تھیں۔ جب کبھی میں ملتان جاتی ان دونوں ڈاکٹر صاحبان سے ملاقات ہو جاتی۔ مشکل یہ تھی کہ امی کو سکولوں کے معائنے کے لیے سارے ضلع میں دورے کرنے پڑتے۔ پاکستان بننے کے بعد ابھی ادارے اپنے طور پر سنبھلے نہ تھے۔ مجھے وہ ساتھ لے کر ریسٹ ہاؤس میں جانا نہ چاہتی تھیں۔ اس لیے ملتان سے مجھے لاہور لوٹا دیا جاتا جہاں کم از کم میرا بھائی تو ہمہ وقت میرے پاس رہتا تھا۔

لیکن پھر نہ جانے کیوں ہمیں 24-ایس کینال پارک بھی چھوڑنا پڑا۔ پتہ نہیں کرائے کا مسئلہ تھا یا اس کوٹھی کے مالک کو خود اس رہائش گاہ کی ضرورت تھی۔ بہرکیف ہم نے بوریا بستر باندھا اور اس گھر کو خیرباد کہہ کر 14-ایس کینال پارک میں جا بسرام کیا۔

یہ نسبتاً نئی کوٹھی تھی۔ اگر پُل سے اتر کر سیدھے نہر کنارے چلتے جائیں تو پہلے موڑ پر بائیں جانب ایک پکی سڑک کینال پارک کی طرف مڑتی ہے۔ یہ گھومتی ہوئی سڑک اندر کی طرف چلی جاتی ہے۔ یہیں 14 ایس واقع تھی۔ کوٹھی کا بایاں حصہ ہمیں تحویل میں دے دیا گیا۔ پتہ نہیں مالک مکان اوپر کی منزل پر رہتے تھے یا دائیں حصے میں۔ ان سے میل ملاقات نہ تھی۔ ریزی کرایہ ادا کر دیتا، وہ لے لیتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ریزی ان دنوں بیکار تھا۔ کرائے کا بوجھ بھی امی کو برداشت

کرنا پڑتا۔ 14-ایس کینال پارک میں ایک ہمارا گھر، ایک ملتان میں اُن کی دفتر سے پیچھے رہائش گاہ۔ تیسرا
ہاؤسوں میں بخشیش کا سلسلہ۔ امی نہ جانے کس طرح گزارہ چلا رہی تھیں۔

ڈاکٹر محمد خاں کی مہربانی تھی۔ کچھ امی کے اندر ان کا آبائی خون جوش مارتا ہوگا۔ انہیں زمینوں کا خبط ہو
اب وہ اس بات کے درپے تھیں کہ ایسی چودھرائی بن جائیں جس کو کچہری میں کُرسی ملا کرتی ہے۔ اسی الاٹمنٹ کے چکر
میں وہ دن رات مگن رہتیں۔ بالآخر انہوں نے 23 مربعے الاٹ کروا لیے جن میں سے چھ مربعے تو اس قدر پیچیدہ
کے تھے کہ یہ اُن کی زندگی میں اُن کے نام نہ ہو سکے اور انہیں بار بار لاہور میں بورڈ آف ریونیو کے دفتر جانا پڑتا۔
نوکری بھی چھوڑ دیتیں اگر مس اقبال ملک ان کو سختی سے منع نہ کرتیں اور ان کا استعفیٰ اپنے ہاتھوں نہ پھاڑ دیتیں۔ آپ
لیڈی میکلیگن سے میری والدہ کے ساتھ رہی تھیں۔ ان دنوں وہ ملتان کے ڈگری کالج کی پرنسپل تھیں اور امی ان کے
پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔

امی کے جو حالات ملتان میں تھے، ہم ان میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے۔ کینال پارک کی کوٹھی ہم دونوں کے
کافی تھی لیکن 24-ایس کینال پارک کی طرح کشادہ نہ تھی۔ لان میں سے گزر کر برآمدہ آتا پھر ایک بڑا کمرہ تھا جسے
دونوں نے بیڈ روم، لیونگ روم بلکہ سب کچھ بنا رکھا تھا۔ باقی دو کمرے استعمال میں نہ تھے۔ ہماری خالہ فیروزہ جو
میں ہیڈ مسٹریس تھیں، چھٹیوں میں اور ویسے بھی وقتاً فوقتاً ہمارے پاس آ جاتی تھیں۔ اسی طرح میری سہیلی محمودہ منظور
کبھار آ جاتی۔

اس گھر سے وابستہ دو واقعے مجھے ابھی تک اچنبھے میں ڈال دیتے تھے۔ مزنگ روڈ والوں میں پتہ نہیں کیسی
مچی ہوئی تھی۔ جب سے تقو اور نیلو ہمارے گھر آنے جانے لگے تھے، کچھ وہ شاید اس شادی کے حق میں ہو گئی ہو
بہرکیف وہاں کیا ہوتا تھا اور کیونکر ہوتا تھا اس کی مجھے واضح اطلاع نہ تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ ہماری چارپائیاں باہر سڑک پر بچھی تھیں۔ کچھ دیر پہلے سب اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔
چارپائیاں اٹھا کر بائیں ہاتھ کی گلی میں رکھ رہی تھی کہ بابا جی محمد خاں آ گئے۔ میں حیران رہ گئی۔ چارپائی ہاتھ سے رکھ کر
سواگت کیا۔ اچھوت کنیا کو آنکنے بھانپنے تول تکڑی پر پورا تولنے کے لیے بابا جی نے کل دس منٹ کا قیام کیا اور چلتے بنے۔

بہت بعد میں جب میری شادی ہوئی اور مزنگ روڈ آنا جانا کھل گیا تو بابا جی نے مجھے ایک دن بتایا کہ انہوں
نے اسی روز فیصلہ کر لیا تھا جب مجھے چارپائیاں اٹھاتی دیکھا تھا کیونکہ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ محنت عزیز تھی۔ وہ محنت
کے آگے نہ تقدیر کو کچھ سمجھتے تھے نہ توفیق الٰہی کو۔ اس اکلوتے واقعے نے غالباً اُن پر یہ ثابت کیا کہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے
دماغ میں کچھ ایسا خناس بھرا ہوا نہیں ہوتا اور شاید گھریلو کام کاج اور روٹین اپناتے ہوئے اُنہیں شرم نہیں آتی۔ وہ بھی عام
گھریلو زندگی گزار سکتی ہیں۔

ان دنوں میری والدہ جب وہ ایک مرتبہ ملتان سے آئیں تو انہوں نے ایک فکر کا اظہار مجھ سے کیا...... ''کاکی
میں تو ملتان میں رہتی ہوں۔ تم ہی ریزی کے لیے کوئی رشتہ تلاش کرو۔''

''رشتہ، امی پہلے یہ پڑھائی تو مکمل کر لے۔ کسی ڈھب کی نوکری پر تو لگ جائے۔''

"کر لی اس نے جس قدر پڑھائی کرنی تھی۔ اب اس کی شادی ہونی چاہیے ورنہ ایک اور بکھیڑا پڑ جائے گا۔ کسی

"کیسا بکھیڑا؟"

"ویلا آدمی ہے، کچھ نہ کچھ گل تو کھلائے گا۔ بس تم کسی نائن سے مل کر یا پھر محمودہ منظور سے کہہ کر کوئی رشتہ تلاش

ریزی ان دنوں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا لیکن حکم عدولی بھی اس کی طبیعت میں نہ تھی۔ ایک رشتہ ڈھونڈ لیا گیا۔ لڑکی کا بھائی انارکلی بازار میں سونے کے زیورات بیچتا تھا۔ اس کی دکان پر ہر قسم کے قیمتی پتھر، کنگن، گلوبند، ہار، کانوں کے بندے، گر بانیاں جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا۔ میں نے ریزی کو حکم دیا کہ وہ گیارہ بجے کے قریب اس دکان پر جا کر لڑکی کے بھائی سے ملاقات کر لے۔ ریزی نے ایڈریس سنبھال لیا اور چپ چاپ چلا گیا۔

شام کو جب ریزی واپس آیا تو اس نے پورے سر کی حجامت کروا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر جو روپ سروپ تھا، ان کے نیم گھنگھریالے بالوں کی وجہ سے ہی تھا۔ ان دنوں چوڑ چپٹ گنجے پن کا فیشن نہ تھا۔ جب سے Yul Brynner ایکٹر نے ٹنڈ کرائی ہے، اس کی دیکھا دیکھی یہ نیند مردانہ وجاہت کا ایک فیشن بن گیا ہے لیکن ابھی گنجے پن کو کسی طور قبول کرنا سوسائٹی کے لیے ممکن نہ تھا۔ سنار صاحب ریزی بھائی سے ملے۔ بوتل پلائی، کچھ زیورات بھی دکھائے اور عام سے گاہک کی طرح رخصت کر دیا۔ سنار صاحب کی دکان کے اوپر رہائش گاہ تھی اور شاید کسی طور عورتوں نے بھی ریزی کو دیکھ لیا ہو۔ لڑکی نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور انکار کر دیا۔

"کیا آپ اس طرح گئے تھے؟"

"ہاں تو اور کس طرح؟"

"یوں سر پر استرا پھروا کر؟"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں بھی ان کا عندیہ سمجھ گئی کہ وہ شادی پر رضا مند نہیں ہیں۔ امی کو خط میں رپورٹ بھیجی تو وہ کچھ دنوں بعد آگئیں۔ امی نے ہمارے ساتھ کبھی دل کی بات نہیں کی تھی۔ غالباً وہ اپنی اولاد سے مایوس تھیں۔ میں ایم اے کرنے کے بعد گھر بیٹھی تھی۔ ریزی نکھٹو ہو کر لاہور کی سڑکیں ناپتا، سرورق مل جاتا تو بنا لیتا لیکن اس کا مستقبل بھی مخدوش تھا۔ غالباً اولاد کی طرف سے مایوس ہو کر انہیں زمینوں کا خیال آیا۔ بہادر عورت کی زندگی کا یہ دوہرا عذاب تھا۔ ممتا کو چھپا کر باپ کی چتا اپنے اوپر اوڑھے وہ دانت بھینچ کر اندر ہی اندر تجویزیں اور فیصلے کرتیں اور پھر اکیلی ہی ان کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتیں۔

ان کے لیے اب دو گھروں کا خرچ اٹھانا بھی آسان نہ تھا۔ پھر اللہ ہی نے ان کی مدد کی۔ میری خالہ جو شیخوپورہ کے گورنمنٹ ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں، تبدیل ہو کر 60- فیروز پور روڈ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تعینات ہو گئیں۔ جونہی ماچھا جی لاہور میں سیٹل ہو گئیں تو امی نے ان سے استدعا کی کہ وہ ہم دونوں کو اپنے پاس رکھ لیں۔

سامان پہلے ہی 24-ایس کینال پارک سے رخصت ہوتے ہوئے گوجرانوالہ میری کزن طلعت (کٹو) لے گئی تھی، اب تھوڑا سامان لے کر ہم دونوں خالہ کے سکول پہنچے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے نہ سوچا کہ مجھے اتنی تعلیم کے ساتھ کچھ ملازمت تلاش کرنی چاہیے۔ ریزی نے کسی مستقل نوکری کے متعلق لمحہ بھر کو توجہ نہ دی۔ ہم خالص بیوہ کی اولاد تھے جس پر ایک محاورہ صادق آتا ہے۔

بیوہ کا پوت..... کُنالی میں مُوت

ملتان

(نانا کے پاس)

(ملتان)

(معرفت ڈویژنل انسپکٹرس آف سکولز بیگم ذاکر چٹھہ)

طوفانی سال

اشفاق صاحب کی زندگی میں 1950ء سے لے کر 1956ء تک بڑے طوفانی سال گزرے۔ جب وہ ہر لمحے جنوں کے مسافر تھے۔ میری جانب ان کے خطوں کی تیز رفتاری کا اندازہ آپ ان خطوں سے لگا سکتے ہیں جو انہوں نے میری والدہ اور بھائی کے نام ملتان میں لکھے۔

وہ لاتعلقی پیدا کرنے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرتے۔ کبھی تراڑ کھیل، کبھی جہلم، کبھی کراچی جا دھمکتے لیکن ان کچھ نے سفروں سے ایک شدید قسم کی محرومی اور تشنگی ان کے اندر در آتی حتیٰ کہ 1952ء میں انہوں نے ملک چھوڑنے کا عزم کیا اور 1955ء تک روم میں ISMEO میں اردو پڑھاتے رہے۔ یہیں انہیں اسکندر باؤسانی (Alessandro Bausani) سے خوب گہرا رابطہ بنانے کا موقع ملا اور پیٹر سانتریڈلی کو اردو پڑھانے کی خوشی حاصل ہوئی۔

میرا بھی ان طوفانی سالوں میں کچھ عجیب سا حال تھا۔ ان دنوں اردو کی پروفیسراں قریب قریب ناپید تھیں۔ مجھے لاہور کالج فار ویمن میں جاب آفر ہوئی تھی لیکن میری والدہ کا خیال تھا کہ عورت جب مالی طور پر خودمختار ہو جاتی ہے تو پھر شادی کے قابل نہیں رہتی۔ میرے لیے بھی بس ایک شادی کا خواب باقی رہ گیا تھا۔

کبھی میں ملتان چلی جاتی، جہاں میری والدہ ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ کبھی لاہور آ جاتی کیونکہ میری والدہ کا کام کچھ ایسا تھا کہ انہیں دوروں پر جانا پڑتا۔ شک و گمان کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے کسی ریسٹ ہاؤس میں اکیلا چھوڑ کر مطمئن نہ ہو پاتیں اور جلد ہی مجھے واپس لاہور بھیج دیتیں۔ جہاں انہیں یقین تھا کہ میرا بھائی کم از کم موجود رہتا ہے۔

ملتان میں میری والدہ کی رہائش دفتر کے ساتھ ہی ملحق تین کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک مرتبہ اشفاق صاحب ریزی سے ملنے کے بہانے وہاں بھی تین دن کے لیے آئے تھے۔ یہ خطوط اور ملنا ملانا گویا جمود کے پانیوں میں پتھر مار کو پھر بھنور صورت متلاطم کرنا تھا۔ مجھے ان کی توجہ سے غلط قسم کی امیدیں بندھ جاتیں۔ وہ امید نہ دلاتے ہوئے بھی دلا جاتے اور پھر گھر والوں کی ناراضگی کے بھوت سے خوفزدہ اور سراسیمہ ہو کر بھاگ اٹھتے۔

آپ کو میری گواہی درست تو نہ لگے گی لیکن میں بار بار آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ دوست دشمن اپنے پرائے کسی کی ولآ زاری کرنے کے اہل نہیں تھے اور اسی درماندہ کوشش کی بدولت وہ کئی دل توڑنے کے مرتکب جاتے تھے۔ یوں سمجھیے ایک کمزور دل انسان کی اس کمزوری نے کتنے لوگوں کو اداس کر دیا؟

ملتان میں امی کی وساطت سے مجھے ڈاکٹر احمد خاں ملے۔ وہ ملتان ڈویژن کی سرکاری زمینوں کے ڈائریکٹر تھے۔ اُن ہی کی وجہ سے میری والدہ کو زمینوں کا خبط ہوا اور انہوں نے زمینیں خرید لیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے عزت کا ایسا مقام پیدا کر رہی ہیں، جہاں کچہری میں زمیندار کو کرسی ملتی ہے۔

ڈاکٹر احمد خاں شوقیہ ہومیو پیتھک علاج بھی کرتے تھے اور بہت عرصہ بعد جب ہم داستان سرائے میں رہتے تھے تو ایک روز وہ ہمارے گھر آئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور موہنی روڈ پر ان کا کلینک ہے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ کوئی ڈاکٹر احمد خاں تشریف لائے ہیں۔ میں انہیں وقتی طور پر بھول چکی تھی۔

''آپ؟..... آیئے اندر بیٹھیے۔''

''نہیں مجھے بیٹھنا نہیں ہے۔ قدسیہ! میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ گھر پر کون بیمار ہے؟''

میں حیران رہ گئی۔

میو ہسپتال میں ڈاکٹر طارق بن افتخار کی نگرانی میں اشیر میاں کا Liver Abcess کا آپریشن ہوا تھا لیکن آپریشن کے باوجود بخار نہ اترا۔ وہ مضمحل پھرتا تھا۔

''جی اشیر..... میرا چھوٹا بیٹا۔''

پھر میں نے ساری تفصیل بتائی۔

''ٹھیک ہے۔ تم اسے لے کر میرے کلینک پہنچو۔ میرے پاس ایک ایسی مشین ہے جس پر لہو کی ایک بوند رکھی دوائی خود بخود تجویز ہو جاتی ہے۔''

اول تو ڈاکٹر صاحب کا آنا کم معجزہ نہ تھا پھر لہو کی بوند سے دوائی کا تجویز ہو جانا اور بھی محیر العقول تھا۔ اب آپ کیا بتاؤں کہ ان کی ہومیو پیتھک دوا سے ہی اشیر صحت یاب ہوا۔

کچھ لوگ آپ کو جب ملتے ہیں تو اُن کی افادیت کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا فیض بہت بعد میں کھلتا ہے۔ کچھ لوگ آپ کو فل سٹاپ کے طور پر ملتے ہیں جیسے تبدیلی، دور اور واقعات کے ختم ہو جانے کی نوید ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ملتان میں ملے اور ان کی افادیت داستان سرائے میں جا کر کھلی۔

ایسے ہی خاں صاحب کی بابرکت ذات تھی۔ وہ مجھے کالج میں ملے اور افادیت ان کی داستان سرائے میں آ کر

تک جب میں نے ان کی مہربانیوں کا پورا بادل برستے دیکھا۔ یہ خطوط اس مہربانی کی اولین پھوار ہیں۔ آپ کی تفریح طبع کے لیے پیش کیے دیتی ہوں۔

شقو جی (اشفاق صاحب) کے خطوط
والدہ بانو قدسیہ کے نام

دیال سنگھ کالج

لاہور

19 اکتوبر 1951ء

حضور امی جان!

اس خط کو بہت پہلے آپ کی خدمت میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ چند ناگزیر حالات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ جس روز آپ ملتان کے لیے روانہ ہو رہی تھیں میں سٹیشن پر گیا تھا اور گاڑی کے روانہ ہو جانے کے ایک عرصہ بعد تک آپ کا منتظر رہا تھا۔ اگلے دن اثر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ دوسرے دن صبح کی بس سے عازم ملتان ہوئی تھیں۔

قدسیہ کی وہ کہانیاں جو ایک عرصے سے میرے پاس تھیں، اچانک طلب کر لی گئیں۔ ایک رات اثر صاحب تشریف لائے اور کہا کہ کاکی نے لکھا ہے کہ وہ افسانے اشفاق سے لے کر اسے پہنچا دیے جائیں۔ میں نے بلا چون وچرا کہانیاں اثر صاحب کے سپرد کر دی اور انہوں نے اسے مقام مقصود تک پہنچا دیا۔

ان کے استفسار پر کاکی نے بتایا کہ اشفاق کو ہر گھڑی میری اور میرے گھر والوں کی تذلیل مقصود ہوتی ہے وہ جان بوجھ کر ان کی بے عزتی کرتا ہے۔ میں آپ کو اس وقت سے امی کہتا رہا ہوں جب میں نے آپ کو دیکھا [illegible] تھا اور میں آپ کو اس وقت تک امی ہی سمجھتا رہوں گا جب آپ مجھے دیکھا نہ کریں گی۔ اگر میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ارادی یا غیر ارادی طور پر آپ کی ہتک کی ہو یا آپ لوگوں کو بیٹا سمجھا ہو تو میری دعا ہے کہ میری ایک بچی ہو اور میری آنکھوں کے سامنے سر بازار اس کی اوڑھنی اتر جائے۔ چوراہے پر اس کی عصمت دری ہو اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ میری موجودگی میں بھرے مجمع میں اس کا نیلام ہو۔ آسمانوں سے لعنتوں کا نزول ہو اور زمین سے مجھ پر تھتکار ہو اور خدا کرے کہ آپ بھی یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ اس کے سوا میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرا فیصلہ آپ کے یا اس کے ہاتھوں میں ہے جسے عرف عام میں خدا کہتے ہیں۔

والسلام

نیاز مند

اشفاق

دیال سنگھ کالج، لاہور

7 دسمبر 1951ء

امی جان!

آپ کا خط مجھے بڑے انتظار کے بعد ملا۔ میں ہر کلاس پڑھانے کے بعد سٹاف روم میں اپنی میز دیکھتا اس پر گوہرِ مقصود نہ ہوتا۔ آخر آخر تو میں ناامید سا ہو گیا تھا لیکن آپ کا اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے جواب ملا۔ پرسوں سے اور معظم سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔

آپ میرے لیے سویٹر بنانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ اس مرتبہ مجھے کافی سویٹرل گئے ہیں۔ ایک خرید لیا ہے اور مواد ضرورت سے زیادہ فراہم ہو گیا ہے۔ اگلی سردیوں پر اگر زندہ رہا تو پھر آپ ہی سے درخواست کروں

اور کیا لکھوں۔ نہ کوئی خاص بات رونما ہوتی ہے اور نہ میں ہونے ہی دیتا ہوں۔ آج طبیعت خراب ہے چھٹی لے لی ہے۔ سٹاف روم میں بیٹھ کر یہ خط لکھنے لگا ہوں۔

تئیس تاریخ کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔ دیکھیے کب آتی ہے اور کیا لاتی ہے۔

میرا جی اس نوکری میں نہیں لگتا لیکن لاہور رہنے کے لیے اور سگریٹوں کا خرچ چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی نکالنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے جب سے سردیاں شروع ہوئی ہیں، ایک مرتبہ بھی کٹ کیٹ نہیں کھائی۔ آپ آئیں لائیں گی تو کھاؤں گا اور کسی کو نہیں دوں گا۔

آپ کا اپنا
شفو

ڈی۔ ایس۔ کالج
لاہور
18 فروری 1952ء

امی جان!

میں کل آپ سے ملنے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ آپ جا چکی ہیں۔ یوں تو میں دو تین گھنٹے وہاں بیٹھا لیکن رہی تھی۔ آج طبیعت خراب تھی۔ اس پر ابا جی نے ذرا سختی کی اور میری حالت غیر ہو گئی۔ گھر سے کالج آیا ہوں لے رکھی ہے اور لائبریری میں بیٹھ کر لائبریرین کے قلم دوات سے یہ خط لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھ میں اور کالج میں ایک فرق تو ضرور ہے کہ..... لیکن میں آپ کو پریشان کیوں کروں۔

پھر کبھی لکھوں گا جس دن میرا ذہن میرے قلم کا ساتھ دے گا۔

آپ کا
شفو

لاہور
7 اگست 1952ء

امی جان!

آپ کے تار کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے پتہ تھا اس دن آپ مجھے ضرور یاد کریں گی۔ اس لیے میں کچھ

ے کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گھر آتا رہا۔

فسوس زندگی کے کتنے ہی سال رائیگاں گئے اور میں کسی کے کام نہ آ سکا۔ نہ اپنے نہ اوروں کے! جب بھی کاکا ت ہوتی ہے تو وہ اسے افسانہ نگاری پر محمول کرتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ بات میرے جی سے نکلتی ہے۔

آپ لوگوں سے جو کچھ ملا ہے، اس کا تذکرہ نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے لیکن میری تنگ دامانی کو ہمیشہ شکوہ رہا کہ وسعت کے تصور سے واقف نہ ہو سکی اور مجھے اپنی کم نصیبی سے شکایت رہی۔

آپ کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں لیکن مجھ پر ایک ہی خوف سوار رہتا ہے کہ کہیں مستقبل کی نحوستیں ت نہ لیں اور میں ویسے کا ویسا رہ جاؤں جیسا ماضی میں تھا۔

آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے شاید یہ آرزو جلد ہی پوری ہو۔ حال میں یا مستقبل قریب میں۔

والسلام

شفقو

D.S.College

Lahore

2 اپریل 1952ء

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

امی جان سلامِ محبت!

ایک شام جب میں پرویز کو ایک ضروری چٹھی دینے کے لیے گیا تو وہ روح فرسا خبر ملی جس کی توقع نہ تھی اور جس حق میں تو کیا شاید آپ لوگ بھی تیار نہ تھے۔ ماچھا کو میں نے تین مرتبہ دیکھا تھا اور تینوں بار سینما میں۔ ایک بار حفیظ ن گی اور پوترا ماچھا کی دعوت کی تھی اور مجھے بھی بلایا تھا۔ دوسری مرتبہ جب میں اتفاق سے ریگل سینما میں موجود تھا اور ور آخری مرتبہ جب قمر صاحب کو کاکی سے کچھ کام تھا اور اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم پلازہ پہنچے تھے۔ پہلی اور ملاقات میں ان سے شاید ہی کوئی بات ہوئی ہو۔ اسی قدر یاد ہے کہ انہوں نے مجھے محبت اور شفقت کی نگاہوں سے تھا اور میری بات کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

تیسری دفعہ ان سے البتہ کچھ باتیں ہوئیں۔ وہ زیادہ تر فلم سے اور میرے حوصلے سے متعلق تھیں۔ میں Under Capric دیکھ کر از بسکہ متوحش ہوا تھا اور انہوں نے اسے کھیل جانا تھا اور مجھے بھی تلقین کی تھی کہ فلم کو فلم ہی ں۔ اگر جانتا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے تو اور بھی باتیں کرتا اور بھی یادیں جمع کرتا۔ ان کا چہرہ ذہن میں لاتا تو آ جاتا ہے مگر دھندلا سا اور ایسا ناپائیدار بن کر کہ زیادہ دیر تک کیفیات کے چکر میں نہیں رہتا۔

میں اس مختصر سی زندگی میں بہت سے تجربات کر چکا ہوں اور ان گنت چیزیں میرے مشاہدے میں آتی رہی ہیں کسی واقعے یا سانحے نے مجھے طرب پسند (Optimist) نہیں بنایا۔ ہم مشرق کے رہنے والے اکثر و بیشتر تقدیریئے